بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا ابوالحسن علی ندوی...... بطور اردو نثر نگار

☆ ڈاکٹر محمود الحسن عارف

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر ان کی تخلیق اور ایمان کی دولت عطا کرنے کے بعد جو سب سے بڑا احسان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انہیں قوت نطق و گویائی عطا فرمائی ......اور اظہار مافی الضمیر کی صلاحیت اور اہلیت بخشی ......قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ٥ عَلَّمَ الْقُرْآنَ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ٥ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ......(۱)

اللہ جو نہایت مہربان ہے۔ اس نے قرآن کی تعلیم دی، اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اسی نے اسے بولنا سکھایا۔

انسانوں کی یہ اہلیت اور صلاحیت جب زبانوں اور رنگتوں کے اختلاف میں بدلتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی عظمت کا ایک نیا گوشہ سامنے آتا ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْ آيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ...... اِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعَالِمِيْنَ...... (۲)

اور اسی کی نشانیوں (اور تصرفات) میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگتوں کا جدا جدا ہونا ہے۔ اہل دانش کے لیے ان (باتوں میں) بہت سی نشانیاں ہیں۔

ایک ہی جیسے انسان جب طرح طرح کی بولیاں بولتے اور مختلف طریقوں اور اسالیب سے اظہار خیال کرتے ہیں تو اس سے زندگی کا ایک نیا رخ اور نیا روپ سامنے آتا ہے اور انسانی زندگی اللہ کی قدرت کا ایک حسین وجمیل مرقع بن جاتی ہے......

پھر اللہ تعالیٰ نے ''زبانوں'' کے اس اختلاف کو ''قلم'' کی طاقت بھی عطا کر دی جس نے

☆ صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

زبانوں کی قدرت کو چار چاند لگا دیئے.....فرمایا:

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ.....(۳)

اسی (اللہ) نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسانوں کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اسے پہلے علم نہ تھا۔

پھر حق تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور صحیفوں کے اتارنے کا جو سلسلہ شروع کیا اس میں بھی زبانوں کے اس اختلاف کو اہمیت عطا فرمائی اور انبیاء علیہم السلام کو انہی لوگوں میں سے مبعوث کیا جو ان کے اولیں مخاطب تھے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ..... (۴)

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ وہ انہیں احکام الٰہی کھول کھول کر بتا دے۔

سب سے آخر میں.....اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرمائی تاکہ آپ ''علوم و معارف'' کو لوگوں کے سامنے بیان کریں، فرمایا:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ..... (۵)

اور ہم نے آپ پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو ارشادات لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو.....تاکہ وہ غور کریں۔

اس سے واضح ہوا کہ زبانوں کی تخلیق اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ''بیان'' یعنی وضاحت اور تشریح ہے.....

پھر ''بیان'' کے بھی کئی درجے ہیں، ایک بیان وہ ہے، جو ایک ان پڑھ شخص کر سکتا ہے۔ دوسرا درجہ عام پڑھے لکھے لوگوں کا ہے، تیسرا درجہ ان ادیبوں اور شاعروں کا ہے، جو ''بیان'' میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کو زبان و بیان کا جو درجہ عطا ہوتا ہے وہ سب سے اعلیٰ اور سب سے ارفع ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا بیان محض لفاظی نہیں ہوتا، بلکہ ان علوم و حقائق کا آئینہ دار ہوتا ہے جو اللہ

تعالیٰ ان کے دل و دماغ پر اتارتا ہے ..... اور حق تعالیٰ کی طرف سے وحی و الہام کے ذریعے ..... جن علوم و معارف کو جلا بخشی جاتی ہے۔

انبیائے کرام ہی کی طرح دینی مصلحین اور داعیان امت بھی فصاحت و بلاغت اور حسن زبان و بیان کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہوتے ہیں اور ان کا کلام ادب و بیان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتا ہے..... مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی، تاریخ اسلام کے انہی داعیان و مصلحین امت میں سے ہیں۔

۲۔ زبانوں کی برادری میں ''اردو'' کا مقام

پھر جس طرح اس دنیا میں انسانوں کی طرح طرح کی قسمیں اور صورتیں ہیں۔ اسی طرح اس دنیا میں کی زبانوں کا بھی ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ زمینی سفر کے دوران میں ..... ہر چند میلوں کے بعد زبانوں میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے اور چند سو میلوں کے بعد تو وہ صورت حال سامنے آجاتی ہے، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں حضرت ذوالقرنین کے تذکرے میں یوں کیا گیا ہے:

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ وَجَدَ	یہاں تک کہ جب وہ دونوں دیواروں کے
مِنْ دُوْنِھِما قَوْمًا لَّایَکَادُوْنَ	درمیان پہنچا تو دیکھا کہ ان کے اس طرف
یَفْقَھُوْنَ قَوْلًا۔ (۶)	کچھ لوگ ہیں کہ ہر بات سمجھ نہیں سکتے۔

''زبانوں کی یونین'' یا ان کی اس ''برادری'' میں ایک سے بڑھ کر ایک زبان ہے، کچھ زبانیں بہت طویل العمر، بہت سنجیدہ، بہت پروقار اور بہت بڑے بڑے علاقوں پر حکمران ہیں۔ جیسے عربی، انگریزی وغیرہ زبانیں، جب کہ کچھ زبانیں ابھی، ان کے مقابلے میں ''نوزائیدہ اور کم عمر'' ہیں، مگر فہم و فراست اور علم و ہنر کے میدان میں بہت گہری مہارت اور اپنے ادبی سرمائے میں بڑی وسعت رکھتی ہیں ..... ہماری قومی زبان ''اردو'' ..... اسی زمرے میں شامل ہے۔

چند سو برس پہلے مسلمان فوجیوں کی چھاؤنیوں اور صوفیائے کرام کی محفلوں سے جنم لینے والی دنیا کی قدیم زبانوں کے مقابلے میں نسبۃً اس کم عمر زبان کے متعلق کسے علم تھا کہ چند ہی

سالوں میں دنیا میں یہ زبان اپنی مثال آپ ہوگی، اس کا شمار دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ہوگا۔ اس میں ہر صنف علم اور اسلوب نگارش کی نمائندہ کتب موجود ہوں گی۔ یہ زبان دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کا نہ صرف مقابلے کرے گی، بلکہ دنیا بھر کے علوم وفنون کا مخزن بن جائے گی..... اور اس زبان میں بڑے بڑے شعراء، بڑے بڑے نثر نگار اور بڑے بڑے صاحبان علم وفضل اور اہلیان علم وفن پیدا ہوں گے..... اور اس کے ذریعے اپنے خوب صورت اور اپنے عمدہ خیالات واحساسات کا جادو بکھیریں گے۔

اردو زبان کی یہ انتہائی خوش بختی تھی کہ یہ زبان ایک ایسے وقت میں معرض وجود میں آئی جب اس کے مرزبوم ''ہندوستان'' میں مختلف علوم وفنون کی فصل تیار ہو چکی تھی اور یہ اپنے اظہار کے لیے کسی طاقت ور زبان کی منتظر تھی..... فارسی اور ترکی زبانیں، جو یہاں صدیوں رائج رہیں مقامی مزاج سے ہم آہنگ نہ تھیں (اگر عربی زبان یہاں رائج ہو جاتی تو عین ممکن تھا کہ صورت حال مختلف ہوتی۔) ان دونوں زبانوں میں ویسی شائستگی، ویسی وسعت، ویسی سادگی اور حلاوت نہ تھی جو یہاں کے لوگ چاہتے تھے اور وہ جو کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، سچ ہے۔ چنانچہ ضرورت نے ایک نئی زبان کو پیدا کیا۔ یہ غالب اور میر تقی میر کی زبان ''اردوئے معلیٰ'' کہلائی۔ جس کا طوطی آج چار دانگ عالم میں بول رہا ہے۔

اس زبان نے جتنی جلدی ترقی کی اور علوم ومعارف کے خزانے جمع کیے۔ اس کی دنیا کی زبانوں میں کوئی اور مثال نہیں ملتی..... اس زبان نے..... اپنی پیدائش کے فوراً بعد چلنا نہیں، بلکہ دوڑنا شروع کر دیا اور آج یہ اپنا سفر پیدل چلنے کے بجائے برق رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر رہی ہے اور تازہ ترین اعداد وشمار کے مطابق یہ واحد زبان ہے جس کے پیچھے کسی ملک کی سیاسی اور سفارتی طاقت نہیں ہے، مگر اس کے باوجود دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے اور سمجھی جانے والی زبان ہے اور یہ زبان حقیقی معنوں میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

زبانوں کی خوش قسمتی یہ ہوتی ہے کہ انہیں کوئی اچھے تخلیق کار، دانشور، شاعر، ادیب اور مصنف مل جائیں، اس اعتبار سے اردو زبان کی خوش قسمتی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ اس زبان کو اس مختصر سے عرصے میں جو بڑے بڑے شاعر اور بڑے ادیب، دانش ور اور مصنف ملے اس

کی مثال شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں مل سکتی ہو۔ یہ اردو زبان ہی ہے جس نے میر تقی میر، میر اسداللہ خان غالب، میر سودا، آتش، مؤمن خان مؤمن، مصحفی، جوش ملیح آبادی، علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور اس طرح کے بیسوں شاعر پیدا کیے۔ دوسری طرف نثر نگاری کی دنیا میں بھی بڑے بڑے ادیب اور بڑے بڑے قلمکاروں نے اس کی گود میں جنم لیا۔

اردو کی نثر نگاری کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی .....تو ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اس سے فیض تربیت پا کر نکلنے والوں کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا، جنہوں نے نثر نگاری کے ایک نئے اسلوب کو متعارف کرایا.....نثر نگاری کے اس سلسلے کی ابتداء علامہ شبلی نعمانی اور ان کے ہم عصر ..... علامہ الطاف حسین حالی نے کی .....مگر ..... اس سلسلے کو اوج کمال تک دو سید زادوں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پہنچایا.....آج ہماری گفتگو کا محور و مرکز .....اول الذکر شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نثر نگاری ہے۔

۳۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نثر نگاری..... کا علمی اور فکری پس منظر

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نثر نگاری پر گفتگو سے پہلے مناسب ہوگا کہ مولانا کی نثر نگاری کے پس منظر پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مولانا ..... جب پیدا ہوئے، یہ دور اگرچہ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی ''محکومی'' کا دور تھا، لیکن دوسرے کئی پہلوؤں مثلاً، مذہبی اور علمی و فکری اعتبار سے بڑا متمول اور بہت باثروت دور تھا۔ تحریکی اور سیاسی اعتبار سے اس وقت مسلمانان برعظیم آزادی اور اپنے الگ وطن کی جدوجہد کر رہے تھے اور ان کی تگ و دو اس وقت باقاعدہ ایک تحریک کی شکل میں منظم ہو رہی تھی۔ بلقان کی ریاستوں میں ترکوں کے خلاف اعلان جنگ، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی اضطراب نے (جسے مولانا ابوالکلام کے الہلال اور البلاغ نے ..... زیادہ پرجوش بنایا) ایک سیاسی بے چینی پیدا کر دی تھی۔ نیز حجاز مقدس میں شریف مکہ کی قیادت میں برپا ہونے والی بغاوت اور پھر القدس الشریف پر برطانوی تسلط نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ہونے والی جدوجہد ایک منظم شکل و صورت ڈھل گئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم، اور پھر خلافت کے خاتمے جیسے واقعات نے لوگوں کے دلوں پر جو انمٹ اور لازوال نقوش چھوڑے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسا ذہین اور حساس شخص جنہوں نے اسی پر آشوب دور (۱۹۱۴ء) میں آنکھ کھولی تھی۔ ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا..... ان حالات کا اثر ہمیشہ مولانا کے ذہنی پس منظر میں موجود رہا اور ان کی ''دعوت وعزیمت'' سلسلے کی تحریروں میں کسی نہ کسی طرح ضرور مہکتا اور روشنی بکھیرتا رہا۔

''رجال'' کے اعتبار سے دیکھیں تو یہ دور بڑے قد آور لوگوں کا دور تھا۔ لاہور میں مولانا احمد علی لاہوری اور علامہ اقبالؒ سے تاثر کا ..... مولانا نے خود ذکر کیا ہے۔ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کے انقلابی نظریات نے بھی، اس نوجوان کے دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑا ..... مولانا نے اپنے والد حکیم سید عبدالحی کا زمانہ نہیں دیکھا تھا (مولانا کے بچپن میں ان کا انتقال ہوگیا تھا)، لیکن مولانا کی کتابوں، خصوصاً نزھۃ الخواطر یا اور اردو کی تاریخ گل رعنا نے ان کے دل و دماغ کو بے حد متاثر کیا تھا۔ مولانا گل رعنا کی بابت لکھتے ہیں:

> ''عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب کی صحبت اور محفلوں میں آب حیات سے متعارف ہوا، سنی اور بارہا پڑھی ..... گل رعنا گھر کی کتاب تھی، اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات حاصل ہوگئیں کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور اس میں حصہ لینے کا شعور پیدا ہوگیا۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''سیر و تراجم کے ذوق و مطالعہ، پھر خصوصیت کے ساتھ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی جلیل القدر تصنیف یا کتب خانہ ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھ جلدوں کے بار بار مطالعہ نے شخصیتوں کو غور سے دیکھنے اور ان کی خصوصیات و اخلاق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے اور ان کے اسلاف سے محبت پیدا کر دی تھی''۔ (۷)

اس کے علاوہ مولانا کی یہ خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور علامہ سید انور شاہ کشمیری جیسے علماء کا زمانہ پایا اور ان

کی مجالس میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا علاوہ ازیں مولانا محمد الیاسؒ (بانی تبلیغی جماعت) اور مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی طویل سرپرستی اور ان سے فیض تربیت کا حصول مولانا ندوی کا خصوصی افتخار ہے۔

اسی بنا پر ان شخصیتوں کے روحانی اور مذہبی اثرات بھی مولانا کی تحریر میں جھلکتے ہیں۔

جہاں تک ان کے اسلوب و انداز تحریر کا تعلق ہے تو اس کے پس منظر میں مولانا ابوالکلام آزاد .....خصوصاً ان کی الہلال اور البلاغ دور کی تحریریں، جن میں سیاست کے بجائے مذہبی اور دعوتی جوش وخروش پایا جاتا تھا، سرسید احمد کی آسان اردو سلسلے کی تحریریں، اور خصوصاً سوانح نگاری میں علامہ شبلی نعمانی اور علامہ الطاف حسین حالی کا انداز اور حدیث وسیرت اور دعوت میں سید سلیمان ندوی .....کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا کے ذاتی علوم وفنون خصوصاً ان کے اپنے مطالعے کی وسعت اور اردو ادب سے مولانا کے ذاتی شغف کے اثرات بھی ان کے اسلوب تحریر میں نظر آتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے لکھنے اور ہاتھ میں قلم پکڑنے سے پہلے اردو، عربی اور فارسی ادب کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ مولانا .....اپنے مطالعے کے اشتیاق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانے میں، میں نے اردو زبان و ادب کی معیاری کتابیں پڑھ لیں۔ دین کے جن داعیوں اور علماء کو آغاز عمر میں اپنے ملک کی زبان و ادب کے مطالعے اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو دین کی مؤثر دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم وتعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ طبقے میں دینی مقاصد کو دل نشین کرنے میں دقت پیش آتی ہے اور ان کی انشاء وتحریر میں وہ طاقت اور دل آویزی نہیں ہوتی۔ جس کی اس عہد میں ضرورت ہے۔'' (۸)

مولانا قاضی سلیمان سلمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین'' نے بھی مولانا کے دل و دماغ پر بے حد اثر کیا۔ اس کتاب کے ضمن میں ننھے علی میاں کی بے تابی اور ان کے ذوق وشوق کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے، مولانا لکھتے ہیں:

''ایک روز ڈاکیا ہمارے چھوٹے سے گاؤں (دائرہ شاہ علم اللہ) رائے بریلی میں ڈاک لے کر آیا، اس کے پاس کتاب کا ایک پیکٹ بھی تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے پاس اس کتاب کو خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ میری والدہ صاحبہ (متوفیہ ۶ جمادی الآخرہ ۱۳۸۵ھ) جن کو اپنے یتیم بچے کی خاطر عزیز تھی، نے یہ رقم دینے سے معذرت کر دی۔ اس لیے کہ اس وقت ان کے پاس کچھ رقم نہ تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت میرا کوئی مددگار اور سفارشی نہیں ہے۔ سوائے اس سفارش کے جس سے اکثر بچوں نے کام لیا ہے اور ان کو اس کا تجربہ رہا ہے کہ اس کی سفارش کبھی رد نہیں کی جاتی۔ یہ وہ سفارش ہے جس کی مدد سیدنا عمیر بن ابی وقاص نے لی تھی اور رسول اللہ نے اس کی سفارش قبول فرمائی تھی اور ان کو غزوۂ بدر میں شرکت کی اجازت دے دی تھی۔ یہ آنسوؤں اور معصوم گریۂ و بکا کی سفارش ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے نیک بندوں کے یہاں اب بھی بہت وقیع ہے اور ضرور سنی جاتی ہے۔ چنانچہ میری شفیق والدہ کا دل قدرتی طور پر نرم پڑ گیا، انہوں نے کہیں سے کوشش کر کے یہ رقم میرے حوالے کی اور میں نے یہ کتاب حاصل کر لی۔''(۹)

بچپن میں مولانا مختلف اہل علم کی مجالس میں شریک اور شامل ہوتے رہے..... اس لیے ان میں بہت اچھا شعری اور ادبی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا اپنی کتاب ''پا جا سراغ زندگی'' میں ''ذوق کیسے پیدا کیا جائے'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

''یہ سب باتیں وہی سمجھ سکتا ہے جو علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی محفلوں میں شریک ہوا ہو۔ مولانا شبلی کو قدرت نے فطری مزاج اور نقاد پیدا کیا تھا۔ مولانا سید ندویؒ ان کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے رہے اور اس کی وجہ سے ان میں وہ شعور و ذوق اور ملکہ پیدا ہو گیا جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ذوق کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی شعر پڑھا جائے تو آپ اپنے ادبی ذوق سے یہ بتلا دیں کہ یہ فلاں کا شعر ہے۔ ایسا نہ

ہو کہ آپ کے سامنے انیس کے اشعار پڑھے جا رہے ہوں اور ان کو آپ غالب و ذوق کی طرف منسوب کریں یا مومن کا شعر ہو اور آپ کسی اور کا سمجھ رہے ہوں، لیکن یہ سب باتیں مختلف مجلسوں میں شرکت کے بعد پیدا ہوں گی۔''(۱۰)

الغرض ان گوناگوں اور متنوع باتوں نے مولانا کی ''تحریر'' کو ایسا خوب صورت، جاذب نظر، دل کش اور آسان اور سہل بنا دیا تھا کہ اردو زبان کی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ مولانا کی نثر نگاری کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ مولانا کا انداز تحریر مکمل طور پر ایک منفرد انداز رکھتا ہے اور مولانا کا یہ رنگ ان کے ہم عصر یا ان سے پہلے کے لوگوں میں سے کسی میں نظر نہیں آتا تو عین مناسب ہوگا۔

۵۔ ادبی مطالعہ کے اثرات

مختلف علمی موضوعات پر مطالعہ کتب کے علاوہ، مولانا نے خالص ادب کی دنیا کی بھی بہت سیاحت کی تھی اور اس موضوع پر بہت سی بنیادی اہم کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ مولانا کی نثر نگاری پر ان ادبی کتابوں اثرات کے بھی واضح موجود تھے۔ گو ان کتابوں کے اقتباسات تو یاد نہ رہے تھے، لیکن ان کتابوں کے اثرات دل و دماغ اور ذہن و قلب پر موجود تھے۔ جو ان کی تحریروں میں خوب صورتی کا روپ دھار کر نمایاں ہو جاتے تھے۔ مولانا ''پرانے چراغ'' میں استاد خلیل عرب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ زبانی یاد کیا ہوا حصہ اگرچہ فراموش ہو گیا، لیکن حافظہ اور ذوق میں وہ اس طرح تحلیل ہو گیا تھا کہ اس کے اجزاء و اثرات جزو ذہن ہو گئے اور تحریر و انشاء میں اس کا رنگ نمایاں ہوا۔ عرب صاحب کے طریقۂ تعلیم کی یہ بھی خوبی تھی کہ وہ اچھے الفاظ تعبیرات و محاورات کا اس طرح چٹخارہ لیتے اور ان کی لذت و حلاوت کا اس طرح اظہار کرتے کہ وہ ہم لوگوں کے دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتے اور ہم سمجھتے کہ ان الفاظ کا لطف لینا اور ان کی قدر ضروری ہے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کے ذہن پر یہ اثر قائم کرتے کہ یہ الفاظ و تعبیرات کسی کی ذاتی ملکیت نہیں اور یہ سربمہر خزانہ ہیں۔ یہ

ہر اس شخص کی ملکیت ہے جو اس کو صحیح طریقہ پر استعمال کر سکے۔ بعض اوقات انہوں نے ہمارے انشاء کی کاپیوں میں کسی محاورہ، ضرب المثل یا جملہ کے صحیح استعمال پر اپنی حیرت کا اظہار کیا، جیسے ہم لوگوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو اور بعض اوقات انہوں نے اس پر انعام بھی عطا کیا۔'' (۱۱)

مولانا کی زبان وقلم پر احادیث نبوی میں موجود دریائے فصاحت و بلاغت کا رنگ اور اس سے اثر پذیری کا انداز بھی نمایاں طور پر نظر سے آتا ہے۔ مولانا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک موقع پر مانگی ہوئی دعا ..... **اللھم انک تسمع کلامی و تریٰ مکانی**، کا ذکر کرتے ہوے۔ لکھا ہے:

''کیا خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی ناتوانی و بے نوائی اور فقر و احتیاط، عجز و مسکنت کے اظہار و اقرار کے سچے اور رحمت خداوندی کو جنبش میں لانے کے لیے ان سے زیادہ پر تاثیر، پرخلوص اور دل نشین الفاظ انسانی کلام میں مل سکتے ہیں اور اپنے دل کی کیفیت اور عجز و مسکنت کا نقشہ الفاظ میں اس سے بہتر کھینچا جا سکتا ہے؟ یہ الفاظ تو دریاے رحمت میں تلاطم پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں، آج بھی ان الفاظ کو ادا کرتے ہوے دل امنڈ آتا ہے۔ آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور رحمت خداوندی صاف متوجہ معلوم ہوتی ہے۔'' (۱۲)

مولانا نے اس کم عمری میں دوسری کتابوں کے علاوہ خاص طور پر مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی کتاب سفینۂ اردو بھی پڑھی تھی ..... مولانا اس کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اس چھوٹی سی عمر میں اس کتاب کے منتخب مضامین اور نظموں نے جو اردو کے بہترین انشاء پردازوں اور شاعروں کے قلم سے تھے، ہمارے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا، خاص طور پر مولانا ظفر علی خان کی نظم ''راجہ دسرتھ کی کہانی ان کی زبانی'' جس میں انہوں نے راجہ دسرتھ کے ہاتھ سے ایک رشی کے لڑکے (جو اپنے بوڑھے باپ کے لیے پانی لینے صبح تڑکے دریا پر گیا تھا، اور ان کے تیر سے گھائل ہو گیا تھا) کی دل دوز کہانی سنائی ہے۔ اس میں ان کی شاعری کا جوہر اور پر اثر مناظر و جذبات

کی تصویر کشی کا کمال اپنے پورے عروج پر ہے۔'' (۱۳)

۴۔مولانا کی نثر نگاری کے متعلق مشاہیر کی آراء

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت ایک عالمی سطح کی شخصیت تھی۔ اس لیے مولانا کی ذات کو بہت سے اہل علم وفضل نے، جن کا شمار عالم اسلام کی مسلمہ اور مقتدر شخصیات میں ہوتا ہے، خراج تحسین ادا کیا اور ان کے ''کمال فن'' کا اعتراف کیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کئی بار اعتراف کیا کہ مولانا اردو بڑی اچھی لکھتے ہیں..... پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''ڈاکٹر ذاکر صاحب کا کسی کی انگریزی یا اردو کے بارے میں یہ رائے دینا میرے نزدیک مصنف کے لیے بڑی معتبر سند ہے۔'' (۱۴)

مولانا کے نام مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، جس کو ان کے جانشین حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے ترتیب دیا ہے اور کتابی شکل میں اسے ''رسائل الاعلام'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً پچاس مشاہیر علماء وادباء اور اہل قلم اور سربراہان ممالک کے ستر خطوط، تین سو سے زائد خطوط کے ذخیرہ سے منتخب کر کے شامل کیے گئے ہیں، یہاں ہم چند اہل علم کی آراء نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں شیخ محمد المجذوب نے لکھا ہے:

''علامہ ندویؒ کی تحریر کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ ان کی عبارت میں ایک غیر معمولی اثر ہے، جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، ان کی تحریروں کو پڑھنے والا مسحور سا ہوجاتا ہے، وہ ان خاص اہل دل افراد میں سرفہرست ہیں جو اپنے جذبات کی شدت و وفور اور جولانی و روانی کو قرطاس تک منتقل کر دیتے ہیں۔ یہ وہ جوہر گرانمایہ ہے جو خاص روحانی ذوق رکھنے والے ادباء کے یہاں ملتا ہے، جو قرآنی ادب کے رمز شناس ہوتے ہیں۔ (۱۵)

شیخ طنطاویؒ، مولاناؒ کے طرز دعوت اور اسلوب تعلیم وتزکیہ کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں

''برادرم ابوالحسن آپ اور آپ کی جماعت اپنے طریقہ پر قائم اور دائم رہے، تمام

داعیان دین کے اسالیب میں آپ کے اسلوب سے بہتر کوئی اسلوب میرے علم میں نہیں ہے جب مضبوط اور مستحکم قلعہ کا معمار عظیم شمار کیا جاسکتا ہے تو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے تو اپنے شاگردوں کی شکل میں اسلام کے بہت سے قلعے تیار کر دیئے ہیں اور علماء وصالحین اور مخلص داعیوں کی ایک امت تیار کر دی ہے۔'' (۱۶)

یہی علامہ طنطاوی مولانا کے اسلوب تحریر کے متعلق لکھتے ہیں:

''برادرم ابوالحسن! ادب کی طرف سے میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا، چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے سننے میں آیا، جس کی لے شریف رضی کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے۔ جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوانغمہ پھر سے مل گیا، یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری ہے، لیکن بے ردیف اور قافیہ کی شاعری، برادرم ابوالحسن! آپ کا صد ہزار شکر یہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا ہے۔'' (۱۷)

جامعۂ ازہر کے ایک استاد فضیلت مآب شیخ احمد االشرباضی نے مولانا کی کتاب قصص النبیین پر اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''مجھے اس بات کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ میں اپنے بھائی صاحبِ فضل سید ابوالحسن پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ہیں ان کا تذکرہ کروں، جو ایسی ہیں کہ ان پر شریف لوگ رشک اور کمینے حسد کرتے ہیں۔ ان کے فخر کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ انہوں نے اللہ کی توفیق کے ساتھ خواص کے لیے ایسی کتابیں لکھی ہیں جو بہت بلند، بہت دقیق، بہت واضح اور بہت گہری سوچ والی ہیں اور جو بڑی عمر کے قارئین کے ہاں بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ مشرق میں بھی (مقبول) ہیں اور مغرب میں بھی، اس کے ساتھ ساتھ انہیں فکر سلیم، عمدہ اسلوب اور غیر معمولی تحقیق کی خصوصیات بھی عطا ہوئی ہیں۔،

پھر اللہ نے انہیں اس بات کی توفیق دی ہے کہ وہ مسلمان نونہالوں کے لیے قرآنی قصوں کے مقاصد کو آسان عبارت اور سہل اسلوب میں بیان کریں، یہ اللہ

کا فضل ہے جو جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔(۱۸)

عرب دنیا کی سب سے زیادہ معروف شخصیت سید قطب، ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے بچوں کی بہت سی کتابیں دیکھی ہیں جن میں انبیاء علیہم السلام کے قصے بھی تھے۔اس کے علاوہ بچوں کے لیے دینی قصوں کے متعدد مجموعوں کی تالیف میں خود بھی شریک رہا ہوں، مگر میں بلا کسی تردد کے گواہی دیتا ہوں کہ اس مجموعے میں جو اس وقت میرے سامنے ہے، سید ابوالحسن کا تحقیقی کام مذکورہ کاموں سے زیادہ کامل و اکمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ عمدہ طباعت اور لطیف توجیہات، نیز واقعات و احوال اور مقاصد کو واضح کرنے کے لیے عمدہ تشریحات پر مشتمل ہے۔ قصوں کے درمیان میں بھی تعلیقات شامل کی گئی ہیں جو کہ اگر چھوٹے بچوں یا بڑی عمر کے لوگوں کے دلوں میں جگہ پالیں تو وہ ان کی عظیم ایمانی حقیقتوں کی طرف رہنمائی کریں گی۔(۱۹)

مولانا ندوی کی عظمت اور ان کے قلم کی تاثیر کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کی کتاب ''حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت'' کے دوسرے ایڈیشن کا مقدمہ بعنوان ''پیغامبر قوم اور اس کے اصول دعوت''، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے۔ جس پر مولانا ندوی نے بے حد خوشی اور مسرت کا اظہار کیا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ بات ہے بھی بہت خوشی اور مسرت والی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کا کسی کتاب پر مقدمہ تحریر کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ کتاب اور صاحب کتاب کو زبردست خراج عقیدت پیش کرنے کے مترادف ہے۔ (۲۰)

اسی طرح مولانا منظور نعمانی نے، جو اپنی علمی اور فکری خدمات کے باعث کسی تعارف اور وضاحت کے محتاج نہیں ہیں اور وہ مولانا کے خصوصی احباب میں تھے، ''حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت'' کا مقدمہ لکھا اور اس میں مولانا کی تحریر اور انداز تحریر کو اپنے مخصوص انداز میں بہت عمدہ خراج تحسین ادا کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے دوستوں میں مؤلف کتاب کو بزرگوں اور دینی شخصیتوں کی سیرت نگاری

اور دینی و اصلاحی تحریکات کی تاریخ نویسی سے خاص مناسبت ہے اور اللہ نے اس کا خاص ذوق ان کو بخشا ہے، اس سلسلے میں مستقل کتاب کی شکل میں ''سیرت سید احمد شہید'' ان کا پہلا نقش تھا اور مولانا الیاس کی یہ سوانح نقش ثانی ہے۔ اہل دین و اہل علم کی سوانح نگاری و تذکرہ نویسی مؤلف کتاب کی آبائی سعادت ہے۔ اور یہ موضوع ان کے لیے بہت سے لوگوں سے زیادہ محبوب و دل چسپ اور سہل ہے.....

ان خصوصیات کے علاوہ خوش نصیب مؤلف کو اللہ کی بخشی ہوئی کچھ اور خاص صلاحیتیں بھی حاصل ہیں جن کا جوہر تو غالبًا ان کی فطرت میں پہلے سے موجود تھا، لیکن ان کا نشو ونما میرے خیال میں مولانا محمد الیاس کے یہاں آمد و رفت اور ان کے ساتھ قلبی تعلق ہی سے ہے۔ جس کا اندازہ ناظرین کرام ان شاء اللہ اس سیرت کے مطالعہ سے کرسکیں گے۔ (۲۱)

ان کے علاوہ بھی بہت سے اکابر علماء اور نقادان فن نے ان کے بارے میں عمدہ آراء دی ہیں، جن کا ذکر موجب طوالت ہوگا.

۷۔ مولانا کے انداز بیان کی خصوصیات

مولانا کی ''نثر'' موتیوں کی ایک مالا محسوس ہوتی ہے۔ گونا گوں اور متنوع خصوصیات و اوصاف کی حامل، اس کا ہر پہلو دیدہ زیب اور دل کش ہے۔ مولانا بڑی خوب صورتی سے اپنی نثر کی عمارت کو سجاتے اور شیشہ و سنگ سے سنوارتے ہیں۔ وہ اس کے ہر پہلو پر خصوصی توجہ مبذول کرتے ہیں اور الفاظ سے لے کر جملوں اور ترکیبوں کی ساخت تک ہر پہلو پر ان کی نظر اور گرفت بڑی وسیع اور مضبوط ہوتی ہے۔ اس ''پیکر حسن'' کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ تیاری

مولانا کسی بھی عنوان پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کی پوری تیاری کرتے ہیں۔ اس کے متعلق تمام دستیاب مواد اور مآخذ پر نظر ڈالتے ہیں..... اور پھر اس پر قلم اٹھاتے ہیں، مولانا نے ارکان اربعہ پر کتاب لکھی تو اس کے مواد کو جمع کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

''پہلے میں نے مواد جمع کیا، مثلاً نماز کے لیے پہلے ایک بار پورے قرآن مجید پر نظر ڈالی، آیات نوٹ کرائیں، حدیث کے لیے جمع الفوائد اور مجمع الزوائد کے ان ابواب پر نظر ڈالی جو ان ارکان کے فضائل و مقاصد و فوائد کے متعلق ہیں اور ان کو نوٹ کیا، پھر خصوصیت کے ساتھ امام غزالیؒ، حافظ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تالیفات احیاء العلوم، زاد المعاد اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں اس پر جو کچھ لکھا ہے اور جو خاص نکتے، ان کی تحریروں میں آئے ہیں ان کو قلم بند کیا۔ پھر ان کو سامنے رکھ کر لکھوانا شروع کیا، گرمی کی شدت شروع ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہا، ذہن و دماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح حاوی ہوگیا کہ دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ عرصہ سے میری زندگی کی ہر اہم تصنیف کا خاصا بن گیا ہے۔ اس کے خلاف کرنا عام حالات میں میرے لیے ممکن نہیں رہا ہے۔'' (۲۲)

اسی طرح وہ ''ارکان اربعہ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''مصنف نے اس کتاب کی تالیف میں قرآن مجید کا از سر نو مطالعہ کیا، حدیث کے صحیح اور معتبر مآخذ کا دوبارہ جائزہ لیا اور ان ارکان کے موضوع، نیز ان کی تشریح و تفصیل اور ان کے مقاصد و اسرار کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مدد ان ائمہ اسلام کی تحریروں اور تحقیقات سے ملی جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے صحیح فہم کا حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور وہ افراط و تفریط اور تکلف و مبالغہ آرائی سے محفوظ رہ کر اس کی گہرائیوں تک پہنچ گئے تھے۔'' (۲۳)

مولانا تیاری کے اس مرحلے میں دوسرے مذاہب و ادیان یا دوسرے تصورات و عقائد پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ ارکان اربعہ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس دوران میں مصنف کو خیال آیا کہ وہ ان دوسرے مذاہب میں بھی ان عبادات کی نوعیت کا مطالعہ کرے جو تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں اور کسی نہ کسی طریقہ سے آسمانی شریعت سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اور جن کو موجودہ دنیا کی ایک کثیر آبادی اب بھی اپنا مذہب مانتی ہے۔ چنانچہ ان مذاہب کی عبادتوں کے طور طریقوں اور ان کے تاریخ و فلسفہ اور احکام و تعلیمات کا

موازنہ اسلام اور شریعت اسلامی کے احکام اور اس کے فلسفۂ وقوانین سے کیا گیا اور اس سلسلے میں ان مذاہب کے ان مراجع وماٰخذ پر اعتماد کیا گیا جو خود ان مذاہب کے علماء ومصنفین کی نظر میں حجت اور لائق شہادت ہیں۔(۲۴)

اسی طرح مولانا اپنی کتاب تزکیہ و احسان یا تصوف وسلوک کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ مضامین طویل تجربہ اور تحقیق ومطالعہ کا نچوڑ ہیں اور آج ان کا یہ مجموعہ تزکیۂ و احسان یا تصوف وسلوک کے نام سے ایک احساس فرض اور ادائے قرض کے طور پر طالبین حق کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔ اس میں متعدد جگہ ان اصحاب کا ذکر بھی ملے گا۔ جن کے احسان سے پورے پورے ملک اور قومیں سبک دوش نہیں ہوسکتیں اور حق کی مخلصانہ ومجاہدانہ کوششوں اور توجہات و فیوض سے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو دولت اسلام اور نعمت ایمان اور آخر میں مرتبہ احسان حاصل ہوا۔ جو نقد جان بلکہ دولت کونین دے کر بھی مل جائے تو ارزاں ہے:

''متاع وصل جاناں، بس گراں است گرایں سودا بجاں بودے چہ بودے''(۲۵)

موضوع پر گرفت اور مطالعے کی گہرائی سے یقیناً مولانا کی نثر پر خوش گوار اثر پڑتا ہے اور اس میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ اس ''عنصر'' کو ہم ''پس منظر'' کا عنصر قرار دے سکتے ہیں.

۲۔ داعیانہ انداز

جیسا کہ مولانا کی زندگی اور ان کی خدمات پر نظر رکھنے والے تمام لوگ اس حقیقت سے بہت اچھی طرح باخبر ہیں کہ مولانا ندوی کی شخصیت پر سب سے زیادہ اثر ان کی ''داعیانہ'' جہت کا تھا.....انہوں نے جو کتابیں بھی تحریر فرمائیں، اسی جہت سے تحریر فرمائیں.....ان کی شخصیت پر مولانا محمد الیاس.....اور مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کی تحریک کا جو اثر تھا، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کی زبان اور ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر جملہ ''دعوت وارشاد'' کے بابرکت سلسلے کی ایک

کڑی تھا ..... مولانا نے افغانستان کے سفر کے دوران میں کابل میں اہل علم سے جو خطاب کیا۔ اس میں مولانا فرماتے ہیں:

''میں نے قوموں اور تہذیب و تمدن کی تاریخ (اور خاص طور سے قوموں اور تہذیبوں کے ارتقاء و انحطاط کی تاریخ) کا مطالعہ بڑی توجہ اور انہماک سے کیا ہے، اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قوموں اور ملتوں کے زوال، ان کی تباہی و بربادی اور انتہائی ترقی یافتہ اور مسحور کن تمدنوں اور تہذیبوں کے زوال اور فنا کا سب سے اہم اور بنیادی سبب ہے ان کے عائلی نظام کا انتشار، گھریلو زندگی میں اعتدال وتوازن کا فقدان، مرد وزن کے ارتباط باہمی میں فساد واختلال، گھریلو زندگی سے عورتوں کی بے توجہی اور اس کی ذمہ داریوں سے فرار..... تاریخ میں جتنی بھی زوال پذیر تہذیبیں اور پستی وانحطاط اور تباہی و بربادی کی طرف تیز تیز قدموں سے بھاگتی ہوئی تو میں نظر آتی ہیں، وہاں یہ بیماری ضرور پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ عورتوں نے گھریلو زندگی سے فرار اور اس کی ذمہ داریوں سے پہلوتہی شروع کر دی۔ وہ مامتا کے جذبہ سے محروم ہوگئیں، اولاد کی پرورش و پرداخت اور نئی نسل کی تربیت اور اس کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں اور اپنے گھر کو سکون واطمینان کا گھر بنانے سے غافل ہوگئیں، جہاں مرد کو امن وعافیت اور سکون وراحت کی دولت میسر آسکے وہ گھر میں داخل ہو تو محسوس کرے جیسے جنت میں آ گیا ہو، بلکہ اس کے بجائے وہ مردوں کی ذمہ داریوں اور ان کی کارگزاریوں کے میدانوں میں برابر کی شرکت، ان کی ہم سفری اور ہم صفیری، ہر میدان میں ان کے دوش بدوش کھڑے ہونے، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا مقابلہ کرنے کے شوق میں پاگل ہوگئیں اور اس کے نتیجہ میں ان معاشروں میں، ذہنی وفکری انتشار، عام لاقانونیت، انارکی اور اخلاقی بحران پیدا ہوگیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکت کے غار کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے قدم اور تیز ہوگئے، یہی قدیم یونانیوں کی کہانی ہے اور یہی قدیم رومیوں اور ایرانیوں کے زوال کی داستان ہے اور مجھے خطرہ ہے کہیں

مشرقی قومیں بھی اسی دردناک انجام سے دوچار نہ ہوں اور رنج وفکر کی بات یہ ہے کہ ہمارے مشرقی اسلامی معاشرہ میں اس کے آثار بھی ظاہر ہو چکے ہیں۔'' (۲۶)

اپنے سفر افغانستان میں انہوں نے مجاہد اسلام، اور فاتح ہند سلطان محمود غزنوی کی قبر پر بھی حاضری دی، یہ موقع تھا کہ مولانا کی تحریر میں سلطان محمود غزنوی کی شاہی سطوت و شوکت اور اس کی پرشکوہ و پرعظمت شخصیت کی جلوہ نمائی ہوتی، لیکن اس کے برعکس یہاں بھی مولانا کو ''مقام عبرت'' پذیری کے آثار ہی نظر آئے، ملاحظہ فرمایئے:

جن کے لیے بری بڑی فوجوں کی قیادت، دوسرے ممالک میں دور تک بے خطر گھستے چلے جانا، پے در پے حملے اور جنگیں ایسی بے حقیقت اور آسان تھیں جیسے آج کے نوجوانوں کے لیے پک نک یا صبح وشام چہل قدمی، انہوں نے ہندوستان میں اسلام کے قدم جما دیے اور مسلم حکومت کی بنیادیں مستحکم کر دیں، جو مختلف خاندانوں کی شکل میں تقریباً آٹھ سو سال تک باقی رہی، ہم مزار شاہی پر تصویری حیرت بنے کھڑے رہے، یہاں وہ شیر سو رہا ہے جس کی ہیبت سے افغانستان و ہندوستان کے بادشاہوں اور سپہ سالاروں کی نیند اڑ جاتی تھی، آج وہ خود محو خواب ہے، محمود کے درباری شاعر فرخی نے اس کی موت پر جو دل دوز مرثیہ کہا تھا، اس کے یہ چند شعر صورت حال کی پوری تصویر کھینچتے ہیں:

خیز شاہا! کہ رسولان شہاں آمدہ اند ہدیہ ہا دارند آوردہ فراوان و نثار

کہ تواند؟ کہ برانگیز دازیں خواب ترا خفتئی خفتئی، کز خواب نگردی بیدار

خفتن بسیار اے خواجہ خوے تو بنود ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار

(ترجمہ) اے بادشاہ اٹھ! بادشاہوں کے قاصد آئے ہیں، جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیے اور تحفے لائے ہیں۔

کس کی طاقت ہے کہ تجھ کو اس نیند سے جگا سکے، تو ایسی نیند سویا کہ اب پھر نہ جاگے گا۔

اے آقا! دیر تک سونا تو تیری عادت نہ تھی، کسی نے اس طرح تجھ کو سوتے نہ دیکھا تھا۔ (۲۷)

''حدیث پاکستان'' میں تین قسم کی قربانیوں کے عنوان کے تحت وہ اپنے مخصوص داعیانہ انداز میں اہل پاکستان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

''آپ کو تین طرح کی قربانیں دینی ہیں، ہماری ہر ایک قربانی کے لیے ہماری تاریخ میں ایک امام موجود ہے، ایک قربانی وہ ہے جو سیدنا خالد بن ولید نے یرموک میں دی تھی۔ دوسری قربانی وہ ہے جو حضرت حسن بن علیؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں امت کے انتشار کو ختم کرنے کے لیے دی تھی، تیسری قربانی وہ ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (اسلامی مملکت اور معاشرے کو اسلامی زندگی اور اسلامی سیرت کی راہ پر لگانے کے لیے) اپنی زندگی کو بدل کر اور اپنے خاندان کے مفاد سے آنکھیں بند کر کے دی تھی۔ اب یہ تینوں قربانیاں پاکستان کی اس ملت اسلامیہ کو درپیش ہیں.

حضرت خالدؓ بن ولید کی قربانی یہ پیغام دیتی ہے کہ عین میدان جنگ میں اگر معزول کر دیا جائے تو پیشانی پر شکن نہ آئے اور یہ الفاظ تاریخ کے ریکارڈ میں اسی وقت محفوظ کر لیے تھے کہ اگر میں ''عمر کے لیے لڑتا تھا تو اب نہیں لڑوں گا اور اگر اللہ کے لیے لڑتا تھا تو میرے جوش وسرگرمی میں کوئی فرق نہیں آئے گا''.....اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ کے اس بندے نے اس کو سچا کر دکھایا اس کے جوش جہاد اور شوق شہادت میں کوئی فرق نہیں آیا.....

حضرت حسنؓ کی قربانی کی عظمت کو ہمارے اچھے اچھے مؤرخ بعض مرتبہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، لیکن وہ قربانی بھی کسی قربانی سے کم نہیں: وہ نواسۂ رسول تھے، بڑے نواسے تھے۔ انصار علیؓ کی تلواریں نیام سے باہر تھیں.....ان کا یہ اجتہاد تھا کہ انہوں نے خلافت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی قربانی بھی کسی قربانی سے کم نہیں وہ جب مدینہ کے گورنر تھے اور حکمران خاندان کے فرد، وہ اپنے اعلیٰ مذاق، نستعلیقی نفاست پسندی کے لیے ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن جب خلافت کا بار گراں ان کے کندھوں پر پڑا تو ان کی زندگی یکسر بدل گئی، انہوں نے اپنے اور اپنے قریب ترین اعزہ کی جاگیریں بیت المال کو واپس کر دیں۔ (۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا یہی داعیانہ جذبہ اور یہی مصلحانہ اور ناصحانہ انداز تحریر انہیں عام ادیبوں اور دوسرے قلم کاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ مولانا کا یہی طرہ امتیاز ہے، جس نے انہیں ان کی طرح ادبی نثر پارے ترتیب دینے والوں کی صف میں ممتاز اور منفرد بنایا۔

(۳) تاریخی و تحقیقی انداز

مولانا چونکہ بنیادی طور پر ایک محقق اور ایک سوانح نگار تھے، اس لیے ان کے انداز بیان پر تاریخی اور تحقیقی انداز کا غلبہ ہے۔ وہ جب بھی کوئی بات کرتے ہیں تو تاریخی تناظر میں کرتے اور تاریخی حوالوں اور تاریخی استناد کی رو سے کرتے ہیں۔ اس خصوصیت نے بھی ان کے انداز بیان اور ان کے اسلوب تحریر میں انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ مثال کے طور اپنے سفر نامہ دریاے کابل سے دریاے یرموک میں افغانستان کی قومیتوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پانچویں صدی ہی سے ہندوستان پر یا تو ترک نسل سے تعلق رکھنے والے خاندانوں کی حکومت رہی جو افغانستان کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوے، وہ جن ملکوں سے گزرتے وہاں کے فوجی اور رضا کار بھی ان کے ساتھ ہو لیتے، مثلاً غزنوی، خاندان غلاماں کے سلاطین، خلجی، تغلق اور اخیر میں مغل یا وہ اپنی نسل، تہذیب اور روایات کے اعتبار سے افغانی ہی تھے، جیسے غوری، لودھی اور سوری خاندان، ہندوستان اسی زمانہ سے ان غیر معمولی جرأت و ہمت اور بے مثال شجاعت وشہامت والے اولو العزموں اور شاہینوں اور عقابوں کی جولان گاہ رہا ہے۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا ان کا اپنا ملک، ان کے بلند عزائم کے سامنے محدود اور تنگ نظر آتا اور فتح وظفر کے شوق کی تسکین اور شجاعت وشہامت کے جوہر دکھانے کے لیے انہیں مناسب میدان نہ ملتا تو ہندوستان کا رخ کرتے۔ ادھر ہندوستان مختلف اوقات میں ذہنی افسردگی، قوائے عملی کی سستی، بدنظمی اور سیاسی انتشار کا شکار ہوتا رہا، ایسے اوقات میں حرکت وزندگی اور جوش وجذبہ سے بھرپور، جفاکش اور جنگجو افغانی ہندوستان کا رخ کرتے، قلیل تعداد کے باوجود بڑی بڑی فوجوں کو شکست دیتے، مضبوط ومستحکم حکومتیں قائم کرتے اور ہندوستانی معاشرہ کے تن ناتواں میں نیا خون دوڑا دیتے۔ (۲۹)

ہندوستان میں آندھی کی طرح چھا جانے والے غزنوی خاندان سے متعلقہ شعراء اور ادباء

کے مزار پر پہنچے تو اس خانوادے کا شاندار ماضی ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ چنانچہ اپنے اسی سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

آستانۂ غزنوی سے وابستگان ومتوسلین میں بدیع الزماں ہمدانی جیسے ادیب وشاعر، ابوریحان البیرونی جیسا ریاضیات وفلکیات کا امام، لافانی شاعر فردوسی اور اس کے علاوہ عسجدی، عنصری، اسدی، غضاری، فرخی، منوچہری جیسے ممتاز فارسی شعراء شامل تھے، سلطان جن شعراء کی کفالت کرتے تھے ان کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے'' (۳۰)

اسی سفر نامہ میں غزنی کی تباہی کے عنوان سے لکھتے ہیں:

غزنی پوری ایک صدی تک شان وشوکت اور تمدن کی بلندیوں پر رہا۔ بیم ورجا، امرونہی اور نفع وضرر کا اصل مرکز بنا رہا، یہاں تک کہ ابھرتے ہوئے عالی ہمت غوری خاندان (جس میں بعد میں شہاب الدین غوری جیسا مجاہد پیدا ہوا) کے پے در پے حملوں کا شکار ہو گیا۔ اس خاندان کا ایک فرد...... علاء الدین حسین بن حسن ...... اپنے زمانہ کے غزنوی حکمراں بہرام شاہ سے خار کھائے ہوئے تھا، کیونکہ بہرام نے اس کے بھائی سیف الدین کو سولی پر چڑھایا تھا، چنانچہ اس نے غزنی پر فوج کشی کی۔ غزنویوں کو شکست دے کر شہر میں داخل ہوا اور تین دن تک لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ شہر میں آگ لگوادی جو پورے شہر میں پھیل گئی، اور خشک وتر سب جل کر راکھ ہو گیا، یہ گلزار شہر کھنڈر میں تبدیل ہو گیا، اور علاء الدین ''جہاں سوز'' کے لقب سے مشہور ہوا، یہ ۵۴۷ھ کا واقعہ ہے اللہ نے سچ کہا ہے ''ان الارض لله یورثها من یشآء'' (زمین اللہ ہی کی ہے، جسے چاہتا ہے اس کا والی ووارث بناتا ہے) ان کھنڈرات سے گزرتے ہوئے ابو العلاء معری کے یہ اشعار ہمارے وردزبان تھے:

خفف الوطأ ما اظن ادیم الا — رض الا من هذه الا جساد

وقبیح بنا وان قدم العهد — هوان الآباء والاجداد

سران استطعت فی الهواء رویدا — لا اختیالا علی رفات العباد

(زمین پر چلنے والو! ذرا آہستہ چلو، کیوں کہ میرے خیال میں روئے زمین ان خفتگان خاک کے جسموں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ آباء واجداد کو زیر زمین گئے ہوئے اگر چہ ایک زمانہ

گزر چکا ہے، پھر بھی ان کی توہین وتذلیل کوئی اچھی بات نہیں۔ اگر ہو سکے تو ان فضاؤں میں ہلکے قدموں سے چلو، اللہ کے بندوں کی بوسیدہ ہڈیوں پر پیر پٹکتے ہوئے تو نہ چلو۔) (۳۱)

دوران تحریر میں مولانا اپنے حافظے اور اپنے ذہنی یادداشت کے خزانوں کو اپنے ہمراہ لے کر بیٹھتے ہیں اور جہاں ضرورت ہوتی ہے، وہاں ان کا حوالہ ضرور دیتے ہیں، مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس پڑھیے۔

ہوٹل کابل میں ہمارے قیام کا انتظام تھا اور حسن اتفاق کہ چالیس سال پہلے علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال اور سر راس مسعود پر مشتمل وفد کابل کے دورہ پر آیا تھا، تو اسی ہوٹل میں قیام پذیر ہوا تھا۔ اس عرصہ میں اس کی عمارت نئی تعمیر کی گئی اور بعض اصلاحات بھی کر دی گئی ہیں، میں جس کمرہ میں مقیم تھا، اس کی کھڑکی امیر عبد الرحمٰن خاں غازی کے مقبرہ کے طرف کھلتی تھی، انگریزوں سے جنگ اور اسلام سے بیگانہ دور دراز علاقوں میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں ان کے عظیم الشان کارنامے مشہور ہیں۔ اس سے عظمت رفتہ اور اچھے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔'' (۳۲)

۴۔ مرقع نگاری/تصویر کشی

ایک اچھے ''نثر نگار'' کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعے اپنے فکر و خیال کے سانچوں میں اس طرح رنگ بھرے کہ وہ سچ مچ زندگی سے معمور نظر آنے لگیں۔ اور خیالات کے بے جان جسموں میں اپنے الفاظ کے رنگوں کے ذریعے اس طرح رنگ بھرے کہ وہ سچ مچ کی تصویریں دکھائی دینے لگیں۔ مولانا کی تحریر بھی انہی صفات وخصوصیات کی حامل تھی۔

مولانا کو قدرت نے الفاظ کے انتخاب، کلمات اور جملوں کی بندش پر اتنا عبور اور اتنی مہارت عطا کی تھی کہ وہ اپنے الفاظ کے ذریعے بہت خوب صورت مرقعے بناتے اور زیر بحث لوگوں کی تصویریں کھینچ دیتے تھے، موزوں الفاظ، خوب صورت ترکیبوں اور پر معانی کلمات ..... مولانا کے انداز بیان کی خصوصیات ہیں ..... مولانا ''مولانا محمد علی جوہر'' ..... کی یاد میں لکھے ہوئے اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس پوری بارات کا نوشہ محمد علی تھے اور وہ اس ہندوستان کے بے تاج بادشاہ معلوم ہوتے۔ گھر سے نکلنا اور کسی عزیز کے ساتھ امین آباد تک جانا ہوتا تو اس سڑک کے دونوں کناروں پر، جس کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے پارک ہیں چھوٹے چھوٹے رسالے جن میں اس طرح کی نظمیں ہوتیں، تصویریں جن میں دکھایا گیا ہوتا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی ہے۔ ہندوستان کی ٹیم میں مولانا محمد علی اور سب کے آخر میں مولانا شوکت علی اپنے بھاری بھرکم جبہ کے ساتھ ہیں اور انہیں کا پلہ بھاری ہے۔ شہر میں اب معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے اور علی برادران اور گاندھی جی ہی کی حکومت ہے۔ پرنس آف ویلز کا لکھنؤ کا آنا بھی یاد ہے، میں کسی ضرورت سے گھر سے نکلا۔ دیکھا تو شہر میں ہو کا عالم ہے، بھرے بازار چلتی ہوئی سڑکیں ویران پڑی ہیں، امین الدولہ پارک (جھنڈے والے پارک) میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی رہی تھی۔ جو لوگ ولایتی کپڑوں میں ملبوس ہوتے وہ راستہ چھوڑ کر چلتے۔ (۳۳)

مولانا صدر یار جنگ کے حالات میں لکھتے ہیں:

''اس شخصیت میں علماء کی تمکنت اور قدیم رؤساء کی نستعلیقی اور وجاہت اس طرح جمع نظر آئی کہ گویا وہ کسی اسلامی مملکت کا کوئی فاضل بادشاہ اور سربراہ ہے، تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ صدر جلسہ نواب یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی علی گڑھ کے رئیس اور حیدر آباد دکن کے صدر الصدر امور مذہبی ہیں، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خود منصب صدارت کی ان سے عزت افزائی ہو رہی ہے۔''

اپنے موقر استاد مولانا سید سلیمان ندوی کے ذکر جمیل میں سید صاحب کا دلآویز خاکہ ملاحظہ ہو:

''سراپا وقار، مجسم متانت، قدمیانہ مائل بہ پستی، چہرہ سے معصومیت اور شرافت نمایاں، دیکھ کر دل شہادت دیتا تھا کہ ان میں دوسروں کو ایذا پہنچانے اور دل دکھانے کی صلاحیت ہی نہیں، لباس نہایت صاف ستھرا جس پر کہیں نکتہ چیں اور دور

بیں کو بھی کوئی دھبہ یا شکن نظر نہ آئے، ہر چند نفاست اور نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف اور اس کے پیچ نہایت خوب صورتی سے دیے ہوئے ..... آواز پست جو قرب کے باوجود، بغیر قدردانی اور شوق کے سنی نہ جا سکے، بالعموم کم گو اور بقدر ضرورت بولنے والے، آنکھوں سے حیا اور ذہانت کا اظہار، کچھ نہاں کچھ آشکار، جب کہیں، آتے مخالف اور موافق فضل وکمال کے معترف اور ان کے منکر دونوں احترام پر مجبور ہو جاتے ..... '' (۳۴)

یہ تو مولانا سید سلیمان ندوی کا ظاہری مرقع اور خاکہ تھا ..... مولانا علی میاں نے ان کے فضل وکمال اور علم وفکر کا جو نقشہ کھینچا اور اس کی جس طرح تصویر کھینچی ہے وہ بھی بس انہی کا حصہ ہے:

'' سید صاحب کے لیے علم کا معاملہ کسی پیشے یا ضرورت یا کسی مجبوری اور مصلحت کا معاملہ نہ تھا، علم ان کا گوشت پوست بن گیا تھا اور ان کے خون میں جاری وساری ہو گیا تھا، وہی ان کی غذا تھی، وہی ان کی تفریح اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا، اکثر دیکھا کہ ان کا تانگہ دار العلوم کے پھاٹک میں داخل ہوا اور جو پہلا شخص ملا اس سے کہا فلاں فلاں استادوں کو خبر کر دو یا کتب خانہ سے فلاں فلاں کتاب لے آؤ، مہمان خانہ پہنچ کر شیروانی اتاری، ہاتھ منہ دھویا اور چائے کے انتظار میں بیٹھے، حدیث وفقہ کے استاذ آ گئے اور کسی علمی مسئلہ پر مذاکرہ شروع ہو گیا۔ کتب خانہ سے کتاب پہنچ گئی اس کا مطالعہ شروع ہو گیا، اس میں کسی فن کی تخصیص نہ تھی، کبھی حدیث کا مسئلہ ہوتا، کبھی فقہ کا، کبھی کوئی تاریخی بحث ہوتی، کبھی تذکرے اور تراجم کی کوئی کتاب، جب تک قیام رہتا ان کی مجلسوں میں علمی مذاکرے اور بحث وتحقیق کے سوا کوئی موضوع نہ چھڑتا، کسی سیاسی شخصیت یا عمائد شہر میں سے کسی کے آ جانے سے کچھ موضوع بدل جاتا، لیکن اس کی جملہ معترضہ سے زیادہ حیثیت نہ ہوتی۔'' (۳۵)

مولانا علی میاں کو ''معنوی'' اور غیر مرئی اشیاء کی ''تصویر سازی'' میں بھی کمال اور یدطولیٰ حاصل تھا ..... اپنے ایک دوسرے بزرگ مولانا سید حسین احمد مدنی کی شخصیت وزندگی کا نقشہ جن الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

''حمیت آپ کی کتاب زندگی کا نہایت روشن عنوان ہے، اسی حمیت نے انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کیا، جس کی آسودگی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک انگریز اس ملک سے چلے نہیں گئے، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کی جدوجہد میں یہی روح کام کرتی رہی تھی اور یہی آپ کو سدا جوان، مستعد وسرگرم رکھے ہوئے تھی اور اسی نے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کو متحرک بنا رکھا تھا، یہی حمیت تھی جس نے آپ سے مہینوں دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف قنوت نازلہ اس جوش وولولہ سے پڑھوائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑ جائیں گے اور الفاظ نہیں ہیں شرارے ہیں، جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں، یہی حمیت ہے، جو کسی منکر شرعی اور خلاف سنت فعل کو دیکھنے کی روادار نہ تھی اور جس کی حرارت اور آنچ آس پاس بیٹھنے والے لوگوں کو اکثر محسوس ہوتی۔'' (۳۶)

اپنے ممدوحین کی بے گناہی، ان کے حالات کی سنگینی اور ان کی عزیمت و استقامت کی جو تصویر مولانا کا قلم بناتا اور سجاتا تھا اس کا اندازہ سید اسماعیل شہیدؒ، کے تذکرے سے بھی بخوبی ہوتا ہے۔ مولانا شاہ صاحب کا عقیدت بھرے انداز میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ سے لے کر اس دن تک شاید کوئی دن طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی، جس کی اور فضیلتیں برطرف اس کی شہادت مسلم اور شہداء کی مغفرت مسلم، تکفیر وتضلیل میں کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو۔ لعنت وسب وشتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو، علماء کی مجلس میں اس پر اتنی لعنت کی گئی جتنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بنی امیہ کے دربار میں نہیں کی گئی، فقہ وفتویٰ کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو اس کے کفر کے ثبوت میں نہ پیش کی گئی ہو، وہ ابوجہل وابولہب سے زیادہ دشمن اسلام، فرعون وہامان سے زیادہ مستحق نار، کفر وضلالت کا بانی، بے ادبوں، گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مقلد وشاگرد بتایا گیا اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کے لیے پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستہ میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا، جن کو خون چھوڑ کر کہ اس کا ان کے یہاں کیا، ذکر اسلام کی صحیح

خدمت میں پسینہ کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزت وعصمت بچانے کے لیے اس نے اپنا سر کٹایا، تو کیا اس کا یہی گناہ تھا اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس پنجاب میں مسلمانوں کا دین وایمان، جان ومال عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، سکھوں کے گھروں میں مسلمان عورتیں تھیں، مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی اور ان میں گھوڑے باندھے جاتے تھے اس وقت یہ غیرت ایمانی وحمیت اسلامی والے جو ایک کلمہ کفر برداشت نہیں کر سکتے تھے کہاں تھے؟ اور کیا آج شاہ ولی اللہؒ کے پوتے کے سوا کوئی کافر نہیں؟''

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن　　بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا　(۳۷)

سچی بات یہ ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں لکھے گئے۔ یہ چند فقرے مولانا پر لکھی گئی بھاری کتابوں اور مبسوط سوانح عمریوں سے زیادہ مؤثر اور زیادہ کارگر ہیں۔ اتنا عمدہ انداز اور اتنا دل موہ لینے والا اسلوب مولانا ہی کو زیب دیتا تھا۔

۵۔ انشاء پردازی

مولانا نے اپنی کتابوں میں کافی حد تک یہ کوشش کی ہے کہ وہ آسان اور عام فہم انداز نگارش اختیار کریں، لیکن کسی کسی جگہ از خود ایسی مرصع اور پرشوکت عبارت پیدا ہو گئی ہے کہ اسے اردو ادب کی انشاء پردزای کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر مولانا اپنے استاد ومربی شاہ عبدالقادر کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''واعظین ومقررین کی شیوہ بیانی اور فصاحت وبلاغت بھی سنی اور مصنفین اور اہل قلم کے ہاں معلومات کی فراوانی اور انشاء پردازی کا زور بھی دیکھا، لیکن یہاں بھی اخلاص کی کمی، عمل کی کوتاہی اور درد وسوز کے فقدان کی وجہ سے ان کے ذریعہ عوام کی بہت کم اصلاح اور انقلاب حال ہوتا دیکھا۔ چودھویں صدی کے وسط کا یہ زمانہ

ہندوستان میں دینی خطابت کے انتہائی عروج وترقی کا دور ہے، لیکن زندگی کا کاروان سست خواب گراں میں مدہوش یا جس غلط رخ پر رواں دواں تھا، اس میں کوئی تغیر نہیں۔'' (۳۸)

ایک اور مقام پر مولانا کی انشاء پردازی کا یہ خوب صورت اور پرلطف انداز ملاحظہ فرمائیے:

''ہندوستان نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام میں صدیوں سے جو دینی نظام تعلیم وتربیت کارفرما تھا اور جس کی حدود گھروں کی چار دیواری سے لے کر مدارس وجامعات، حلقہائے درس، گوشہ ہائے تصنیف وتالیف، خانقاہوں کی پرسکون فضاؤں اور سعی وجہد کی متحرک وپرشور رزم گاہوں تک وسیع تھے اس کی بنیاد اخلاص وللّٰہیت، ایمان وایقان، اساتذہ وشیوخ کے معاملے میں کامل اطاعت وانقیاد، مربیوں ومحسنوں کے مسئلے میں مکمل تفویض وتسلیم، مقاصد زندگی کے بارے میں توکل وقناعت، اعتماد علی اللہ، بلکہ اپنا محنت ومطالعہ اور حصول کمال کے سلسلہ میں استغراق وخود فراموشی، معاصرین کے ساتھ تعلقات میں تواضع واعتراف، مختلف الخیال عناصر، افراد وجماعتوں کے سلسلہ میں حسن ظن، التماس عذر اور جمع بین الاضداد کی قوت وصلاحیت کمالات علمی اور مدارج باطنی کے حصول میں علوے ہمت ومجاہدہ، رفقائے کاروشرکائے حیات کے بارے میں اپنے فرائض کی ادائیگی سے سروکار اور اپنے حقوق کے مطالعہ سے خاموشی پر تھی۔ اس نظام تعلیم وتربیت کا (اپنی محدود معلومات اور کوتاہ نظر میں) بظاہر آخری نمونہ اور جامع ترین پیکر حضرت شیخ الحدیث (مولانا محمد زکریا) کی ذات تھی۔'' (۳۹)

مولانا کی کتابوں میں اس طرح کے ''شہ پارے'' جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قادر الکلامی کا ایسا خزانہ عطا فرمایا تھا کہ وہ اپنے شہسوار قلم کو روک روک کر اور بہت بچ بچ کر چلاتے تھے، مبادا انشا پردازی کے اسلوب کی بنا پر ان کی تحریر میں اغلاق اور ابہام پیدا ہو جائے اور اسے لوگوں کے ہاں ایک مشکل تحریر اور خود انہیں ایک مشکل مصنف سمجھا جانے لگے ..... پھر بھی جا بجا اعلیٰ ترین انشاء پردازی کی مثالوں کی ان کے کلام میں

کمی نہیں ہے۔مثال کے طور پر.....درج ذیل اقتباس دیکھیے۔

''دہلی نواح دہلی، اور دوآبہ میں ایسی خانقاہیں اور روحانی تربیت کے مرکز تھے جو پوری یک سوئی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے۔دہلی کی شہرۂ آفاق خانقاہوں کے دور انقلاب کے بعد اخیر دور میں گنگوہ اور تھانہ بھون کے روحانی و تربیتی مرکز مرجع خاص و عام بنے ہوے تھے۔پھر جب ان پر بھی دورِ انقلاب آیا اور سنت اللہ کے مطابق رشد و ہدایت کی یہ شمعیں بھی (اپنے مشائخ کی وفات کے بعد) خاموش ہوگئیں تو اسی سلسلہ روحانی کی ایک کڑی رائے پور کی خانقاہ، نہ صرف اس نواح، بلکہ صوبجات متحدہ سے لے کر پنجاب تک کا روحانی و تربیتی مرکز بن گئی۔ملک میں بڑے بڑے انقلاب آئے۔بڑے بڑے سیاسی طوفان اٹھے، اور آندھیاں چلیں، ملک تقسیم ہوا، لیکن ان تیز و تند ہواؤں میں بھی یہ چراغ جلتا رہا۔نہ رائے پور میں ذکر اللہ کی سرگرمی میں کوئی فرق آیا اور نہ یہاں دعوت اور موضوع میں کوئی تبدیلی ہوئی۔'' (۴۰)

مولانا بنیادی طور پر ایک، سیرت و سوانح نگار تھے، سوانح نگاری کا سلیقہ مولانا کو ان کے والد محترم سے وراثت میں ملا تھا۔دوران سوانح نگاری ان کی نوک قلم سے برجستہ طور پر ایسے الفاظ و کلمات نکل آتے ہیں کہ وہ ایک ادبی شہ پارہ محسوس ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر ''تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی میں ''بدل و عطا'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''زہد و توکل کا طبعی و لازمی نتیجہ بذل و عطا اور جود و سخا ہے، جس صاحب یقیں پر دنیا اور دولت کی حقیقت منکشف ہوجاتی ہے اور قل متاع الدنیا قلیل کا استحضار ہوجاتا ہے وہ بخل کے ہر شائبہ سے پاک ہوجاتا ہے۔جس کو اشرفیاں سٹکیاں اور ٹھیکریاں نظر آنے لگتی ہیں اور مال کی محبت دل کے ہر گوشہ سے نکل جاتی ہے اس کا ہاتھ کون روک سکتا ہے۔'' (۴۱)

۶۔مترادفات کا استعمال

مولانا ابوالحسن علی ندوی .....حسب ضرورت .....مترادف اور ہم معانی الفاظ کا بڑی

کثرت، مگر بڑی نفاست کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور بہت خوب کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ایک اچھے شاعر اور ادیب کی طرح الفاظ وکلمات کا بہت وسیع اور بہت عمدہ ذخیرہ تھا اور وہ ایک ماہر کاریگر اور ماہر فن کی طرح ان کا بڑی ترتیب اور بڑے سلیقے سے استعمال کرتے تھے۔ چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

''اچانک آندھی آئی، افق سے ابر اُٹھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسی ژالہ باری ہوئی کہ خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں، خیمے لوگوں پر گر گئے، رونے والوں کی چیخیں نکل گئیں، ہمارے معلم (سلیمان ہاشم) داڑھیں مار مار کر رو رہے تھے، ایک حشر کا منظر تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انابت کی ایک عام فضا پیدا ہوگئی اور آنکھوں نے اشک باری اور دلوں نے اضطراب و اضطرار کی وہ مقدار چند لمحوں میں پوری کر دی جو پورے دن کے وقوف و قیام میں نہیں ہوئی تھی تو اچانک مطلع صاف ہوگیا اور تھوڑی دیر کے لیے اولے اور پانی کا وہ چھینٹا وہ کام کر گیا جو بیسوں دینی ادارے اور واعظین اور سحر انگیز مقررین کی منظم جماعتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ **وما یعلم جنود ربک الا ھو**. (۴۲)

حضرت مولانا محمد الیاس کے ساتھ ان کا بہت گہرا اور پائیدار تعلق رہا۔ ان کی سوانح عمری میں میوقوم کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سادگی اور جفاکشی، عزم وقوت عمل، پختگی اور صلابت اس قوم کے خاص جوہر تھے، جس میں میواتی مسلمانوں کی شہری آبادی سے بہت ممتاز تھے۔ یہ پختگی اور صلابت اور حمیت ہی کا نتیجہ تھا کہ عملاً اسلام سے اتنے دور ہو جانے کے باوجود اس علاقے میں انتہائی طغیانی کے زمانہ میں بھی ارتداد کا سیلاب کبھی نہیں آنے پایا اور باوجود اس کے کہ اس کے ہمسایہ ملک اس عام سیلاب میں گلے گلے پانی میں تھے، مگر میوات اس کی زد سے باہر رہا اور اس وسیع علاقہ میں ارتداد کے واقعات پیش نہیں آئے۔(۴۳)

مولانا کے ہاں مترادفات کا استعمال تکلف اور تصنع کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ اس میں

ایک فطری انداز، ایک شائستگی، ایک حسن ترتیب اور ایک حسن لطافت و نفاست نظر آتا ہے۔
مولانا سید سلیمان ندوی کے حالات میں لکھتے ہیں:

''وہ ندوہ کو قلب درمند، دین ارجمند، اور زبان ہوش مند تینوں کا مجموعہ دیکھنا چاہتے تھے اور اسی ترتیب و تناسب کے ساتھ پہلا مقام قلب دردمند کا ہو، دوسرا ذہن ارجمند کا اور اس کے بعد ان کی ترجمان زبان ہوش مند ہو۔ ندوہ میں دینی شخصیتوں اور دینی مرکزوں سے جو بیگانگی عرصہ سے چلی آ رہی تھی۔ اس میں کچھ کمی تو خود سید صاحب کے اس جدید تعلق اور رجحان سے پیدا ہوئی جس کا اوپر تذکرہ ہوا۔ اور کچھ کمی مولانا الیاس صاحب نے اس ہفت روزہ قیام سے جو ندوہ ہی کے مہمان خانہ میں تھا اور جس میں انہوں نے ماحول کو پورے طور پر اپنے سوز دروں اور اپنی روح اور اپنے جسم کی بے تابی سے بے چین اور متحرک رکھا، لیکن سید صاحب اس سے زیادہ چاہتے تھے۔'' (۴۴)

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے متعلق اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''پھر ان کی زندگی کا خاص جوہر ان کی وہ وسیع بوقلموں و گونا گوں ثقافت تھی، جس میں وہ فرد فرید تھے۔ ہندوستان میں اسلامی عقائد و تعلیمات کے فیض، تصوف کے پیدا کیے ہوئے درد و محبت اور وسعت نظر ہندوستان کے خمیر کی آشنا پرستی اور وفا شعاری، رنگ و آہنگ سے اثر پذیری، ترکوں کی مہم جوئی، وسیلہ گیری، افغانوں کی شجاعت و شرافت، مغلوں کے ذوق جمال و قوت ارادی، عجم کے حسن طبیعت، اور عرب کے سوز دروں سب سے مل کر ایک خاص تہذیب اور ایک خاص ثقافت وجود میں آئی جس کا نمونہ طبقہ امراء میں عبدالرحیم خانؔ خاناں، شعراء میں امیر خسرو، اولیاء اللہ میں خواجہ نظام الدین اولیاء، اور علماء میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نظر آتے ہیں۔ اس تہذیب و ثقافت میں شکوہ بھی ہے اور تواضع بھی۔ حلاوت بھی ہے اور مروت بھی، گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے اور رقت بھی، استقامت بھی ہے اور رواداری بھی۔ اس کی قلمرو میں علوم شریعت و حکمت بھی ہیں

اور ادب و شاعری بھی، فقر و درویشی بھی ہے اور نفاست و ذوق سلیم و لطیف بھی۔ اس کی دل چسپی کے میدان قلعے بھی ہیں اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں اور خانقاہیں بھی، تحقیق و تصنیف کے حلقے بھی ہیں اور مشاعرے بھی، اس میں ثقافت بھی ہے اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے اور سبک روحی بھی، اس کے اظہار خیال اور اظہار کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے اور فارسی بھی، اردو بھی ہے اور ہندی بھی، یہ وہ تہذیب و ثقافت ہے جس نے فاتحین اسلام کے داخلہ ہند کے بعد سے اپنا کام کرنا شروع کیا۔ پھر شاہ جہان و عالمگیر کے بعد کے دور میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ..... یہ وہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت ہے، جو نہ خالص ہندوستانی ہے، نہ خالص ایرانی، نہ عربی ہے نہ عجمی، بلکہ ان سب کے محاسن کا مجموعہ اور تہذیب و تمدن کے میدان میں ایک نیا تجربہ یہی تہذیب و ثقافت تھی، جس کے آخری نمونوں میں ایک نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی تھے اور جو غالباً اپنی پختگی، توازن اور جامعیت کے لحاظ سے انہی پر ختم ہوگئی۔'' (۴۵)

اس طرح مولانا کی نثر نگاری اپنے دور کی سب سے طاقت ور اور سب سے عمدہ نثر نگاری ہے۔

۷۔ موزوں اور حسب حال اشعار کا استعمال

اردو میں نثر نگاری کی روایت میں، موزوں اور برجستہ اشعار کا استعمال ہے۔ اس روایت کو مولانا ابوالکلام آزاد نے منتہائے کمال پر پہنچایا، مگر ''تذکرہ'' کے سوا ان کی نثر میں اشعار کا استعمال بعض اوقات تکلف اور ''آورد'' محسوس ہوتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی اور ان کے دبستان سے تعلق رکھنے والے اہل علم نے ..... اشعار کا بہت کم استعمال کیا ہے۔ البتہ مولانا ندوی کے ہاں اس میں بھی ایک اعتدال اور میانہ روی کا اسلوب نظر آتا ہے..... ان کی کتابوں میں اشعار سے مکمل اجتناب بھی نہیں ہے اور ان کا بے حد اور بے جا استعمال بھی موجود نہیں ہے۔ جہاں وہ مناسب خیال کرتے ہیں اور عبارت میں اس کی جگہ بنتی ہے تو وہ اشعار شامل تحریر کرتے ہیں، ورنہ نہیں۔

مولانا کو اردو، عربی اور فارسی کے بہت سے شاعروں کا کلام ازبر تھا۔ علامہ اقبال سے انہیں خصوصی انس اور شغف تھا۔ ان کے علاوہ اردو کے تمام بڑے بڑے شعراء کا کلام انہیں یاد تھا اور وہ ان کے اشعار کا نہایت موزوں طریقے پر استعمال کرتے تھے۔

مولانا کی کتابوں سے ان کے استعمال کردہ اشعار کو اگر جمع کیا جائے تو اشعار کا ایک اچھا خاص دیوان جمع ہوسکتا ہے (کیا عجب کوئی صاحب علم یہ کام بھی کرگزریں) ان کی ہر کتاب میں بلاشبہہ بیسوں اشعار ملتے ہیں۔

مولانا نے ۱۳۷۷ء (۱۹۴۸ء) میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کا تذکرہ لکھا، اس وقت مولانا کی جوانی، بلکہ نوجوانی کے دن تھے۔ اس کتاب میں مولانا نے جن اشعار کا حوالہ دیا ہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

مجنوں بہ خیال لیلیٰ دردشت دردشت بجستوے لیلی می گشت
می گشت بدشت برزبانش لیلی لیلیٰ می گفت تازبانش می گفت (۴۶)

من کی دنیا من کی دنیا
سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا
سود و سودا مکر و فن (۴۷)

مزید لکھتے ہیں:

در خرمن کائنات کردیم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ (۴۸)

اسی صفحہ پر انہوں نے امرخسرو کے ان اشعار کا بھی حوالہ دیا ہے:

ناخوش آں وقتے کہ برزندہ دلان بے عشق است
ضائع آں روزے کہ برمستان بہ ہشیاری گذشت

اسی صفحے پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے۔

دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کرڈالے خموش

مولانا کے مطابق شیخ گنج مرادآبادی نے ایک موقع پر یہ اشعار پڑھے:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد (۴۹)

مولانا گنج مرادبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہیں اس قسم کے اشعار پسند تھے:

صحبت یک ساعت با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں
ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے (۵۰)

ایک جگہ مولانا نے نورمیاں صاحب کے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے:

جا اے خیال غیر کہ فرصت نہیں یہاں ہیں جلوہ نگار کی مہمانیوں میں ہم (۵۱)

مولانا گنج مرادبادی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اکثر قائم کا یہ شعر پڑھتے:

دل ڈھونڈھنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے ہاں راکھ کا اور آگ دبی ہے (۵۱)

حدیث دوست کے عنوان کے تحت درج ذیل شعر کا حوالہ دیا ہے:

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم (۵۲)

اس سے اگلے صفحات پر درج ذیل اشعار کا حوالہ دیا ہے:

سحر میں سامری کے کیا قدرت تیری آنکھوں میں جو اثر دیکھا

ہجوم داغ نے میرے یہ گلفشانی کی کہ اس نے آپ تماشے کو مہربانی کی (۵۳)

عاشقان را روز محشر با قیامت کار نیست کار عاشق جز تماشائے جمال یار نیست

نزد عاشق درد و غم حلوا بود گرچہ بادیگر کساں یلوا بود (۵۴)

اگلے صفحے پر ایک عربی شعر کا حوالہ دیا ہے:

سقونی وقالوا لاتغنّ ولو سقو

جبال سلیمی ماسقیت لغنت

(مجھے جام محبت پلایا اور ترنم اور نغمہ سرائی سے منع کیا، حالانکہ پہاڑوں کو بھی یہ جام پلا دیا جائے تو وہ نغمہ سرا ہو جائے۔)(۵۵)

اس تذکرہ میں مولانا نے ''اشعار عاشقانہ'' کے عنوان کے تحت ..... درج ذیل اشعار کا تذکرہ کیا ہے:

اے خوش آں چشمے کہ گریاں می نمود اے خوش آں جانیکہ بریاں می نمود

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانۂ تو ہر دوجہاں راچہ کند(۵۶)

اسی عنوان کے تحت مولانا گنج مرادآبادی سے درج ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو(۵۷)

کس نے پھر مانگ کہا کس نے منگایا مجھ کو کس نے دیوانہ صفت آپ ٹھہرایا مجھ کو

تو وہ داتا ہے کہ سیری نہیں دینے سے تجھے لذت جود سے پھر مانگ سکھایا مجھ کو

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں(۵۸)

ہجوم داغ نے میرے یہ گلفشانی کی کہ اس نے آپ تماشے کو مہربانی کی

دن میں سو سو بار واں جانا مجھے اس میں سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

دل کس کی چشم مست کا سرشار ہوگیا کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہوگیا

اسی جگہ چند ہندی اشعار بھی نقل کیے ہیں:

اسمن مور بعد گیو تو ہیں سمرن تور بسرگیو مو ہیں

اپنے پیا پرتن من واروں جوواروں سوتھوڑا اے ندیا کنارے مورلا بولے میں جانوں پیا مورا اے

گونا کے باجے ماجن لاگے، انگنا میں ٹھاری لجاؤں ان کے نام کی آسا لگی ہے، جن کا محمد ناؤں (۵۹)

جایئے کس واسطے درد میخانہ کے بیچ اور ہی ہستی ہے اپنے دل کے پیمانہ کے بیچ

کیا کریں سیر چمن، یاں آرزو کچھ اور ہے گل کو کیا سونگھیں دماغ اپنے میں بو کچھ اور ہے (۶۰)

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

بادنسیم آج بہت مشک بار ہے شاہد ہوا کے رخ پہ کھلی زلف یار ہے

جب عشق میں تیرے بھر گئے ہم تو ہی رہا گذر گئے ہم
تیری ہی طرف کو راہ نکلی بھولے بھٹکے جدھر گئے ہم

(مولانا گنج مرادآبادی)

تر ہوئی باران سے سوکھی زمین یعنی آئے رحمۃ للعالمین (۶۱)

اتباع سنت اور احترام شریعت کے حوالے سے درج ذیل شعر سے بہتر .....کوئی شعر موزوں نہیں ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر سوسنا کے نہ نداند جام وسندان باختن (۶۲)

گر دنعل اسپ سلطان شریعت سرمہ کن تا شود نور الٰہی با دو چشمت مقترن

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہ ہاست بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی (۶۳)

مولانا نے حکیم عظمت حسین صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ دم رحلت تک برابر حدیث پڑھتے رہے، پھر ان اشعار کا حوالہ دیا ہے:

غیرت از چشم برم روی تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم
گر بیاید ملک الموت کہ جانم بہ برد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم (۶۴)

پھر زہد و توکل کا ذکر کرتے ہوے..... یہ شعر نقل کیا ہے:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی (۶۵)

صد تمنا در دلت اے بوالفضول کے بود نور خدا در دل نزول
بند بگسل باش آزاد اے پسر چند خواہی بند سیم و بند زر (۶۶)
جو ہم دل پہ اس کا کرم دیکھتے ہیں تو دل کو بہ از جام جم دیکھتے ہیں (۶۷)

کتاب میں گریۂ محبت کے تحت درج ذیل اشعار نے بڑا سماں باندھا ہے:

نہ ہو دیدار میسر تو نہ ہو در جاناں کی زیارت ہی سہی
نہ ہو قسمت میں مرے ساغر مے ترے میخانہ کی خدمت ہی سہی (۶۸)

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا (۶۹)

بادنسیم آج یہ کیوں شک بار ہے
شاہد ہوا کہ رُخ پہ کھلی زلف یار ہے (۷۰)

مولانا گنج مرادآبادی کے متعلق لکھا ہے وہ شعر اس پر اتنا روئے اور عجیب کیفیت کی حالت تھی کہ

بیان میں نہیں آتی۔

بندہ عیب دار کس نخرد باہزاراں گنہ خرید مرا (۷۱)

اے شہ آفاق شیریں داستاں بازگو ازبے نشاں من نشان
صرف و نحو منطقم راسوختی آتش عشق خدا افروختی

خدمت مرداں اگریک ساعتست
بہتر از صد خدمت و صد طاعت است (۷۲)

فسھل یا الٰہی کل صعب
بحرمۃ سید الابرار سھل (۷۳)

سرم خاک رہ پرچار سرور
ابوبکر و عمر و عثمان وحیدر (۷۴)

گفتۂ گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود (۷۵)

حوالہ جات وحواشی

۱۔ الرحمٰن۔۵۵/۱۔۴

۲۔الروم (۳۳/۲۲)

۳۔العلق (۹۴/۵۔۴۔۵)

۴۔ابراہیم (۱۴/۴)

۵۔النحل (۱۶۴/۴۴)

۶۔الکہف (۱۸/۹۲)

۷۔ کاروان زندگی، حصہ اول۔ص۱۹۴۔۱۹۵۔

۸۔ پرانے چراغ، دوم، ص۱۸۰

۹۔کاروان زندگی، ص ۵۔۶

۱۰۔ پاجاسراغ زندگی، ص ۶۹

۱۱۔ پرانے چراغ، ،۱:۱۲۶

۱۲۔ کاروان مدینہ، ص ۱۱

۱۳۔کاروان زندگی، ص ۲۱۱

۱۴۔

۱۵۔رسائل الاعلام

۱۶۔

۱۷۔قصص الانبیاء، ترجمہ قصص النبین، حصہ دوم۔ص ۴

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔قصص الانبیاء، حصہ سوم، ص ۴، ترجمہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف، مطبوعہ مطبع ادب اسلامی، لاہور

۲۰۔ حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۹ تا ۲۹، (مئی ۱۹۴۷ء)

۲۱۔حضرت مولانا محمد الیاس، ص ۳۸، ۳۹

۲۲۔کاروانِ زندگی، ج ۲، ص ۱۷

۲۳۔ارکان اربعہ، کراچی، بدوں تاریخ، ص ۱۲، ۱۳

۲۴۔ارکان اربعہ،ص ۱۶

۲۵۔تزکیۂ واحسان،۱۹۸۰ء،کراچی ص ۱۱۔

۲۶۔دریائے کابل سے دریائے یرموک تک،ص ۳۳۔۳۴

۲۷۔ایضاً،ص ۵۰،۵۱

۲۸۔حدیث پاکستان،کراچی ۱۹۷۹ء،ص ۱۶۔۱۸۔

۲۹۔دریائے یرموک،ص ۱۶۔۱۷

۳۰۔دریائے کابل.....ص ۲۵

۳۱۔ایضاً

۳۲۔دریائے کابل سے دریائے یرموک تک،۱۹۷۶ء کراچی،ص ۲۵۔۲۶

۳۳۔پرانے چراغ،کراچی،۱۹۸۱ء،ص ۱۲۔۱۳

۳۴۔پرانے چراغ،ص ۲۳

۳۵۔پرانے چراغ،ص ۲۳۔۲۴

۳۶۔ایضاً

۳۷۔آبادشاد پوری،دعوت وعزیمت کے روشن ستارے،ص ۲۳۳، ۲۳۳

۳۸۔سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری،ص ۹۰،رشیدہ ۱۹۶۶ء

۳۹۔سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا ص ۹۔۱۷

۴۰۔سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری،ص ۱۰۸

۴۱۔تذکرہ حضرت مولانا گنج فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی،کراچی،۱۹۷۷ء،ص ۶۱

۴۲۔سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری،ص ۱۷۸

۴۳۔حضرت مولانا محمد الیاس اوران کی دینی دعوت،کراچی ۱۹۷۹ء،ص ۷۶

۴۴۔پرانے چراغ،کراچی،ص ۳۹۔۴۰

۴۵۔پرانے چراغ،حصہ دوم،ص ۳۲،۳۳

۴۶۔تذکرہ،مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی،مطبوعہ مجلس نشریات اسلام،کراچی،۱۹۷۷ء،ص ۲۱۔

۴۷۔تذکرہ،ص ۲۹

۴۸۔ایضاً،ص ۳۶

۴۹۔ایضاً،ص ۳۶

۵۰۔ایضاً،ص ۳۸

۵۱۔تذکرہ،ص ۴۰

۵۲۔ایضاً،ص ۴۱

۵۳۔ایضاً،ص ۴۲

۵۴۔ایضاً،ص ۴۳

۵۵۔ایضاً،۴۴

۵۶۔ایضاً،ص ۴۴

۵۷۔ایضاً،ص ۴۵

۵۸۔ایضاً،ص ۴۵

۵۹۔ایضاً،ص ۴۵۔۴۶

۶۰۔ایضاً،ص ۴۶۔۴۷

۶۱۔ایضاً ص ۴۶۔۴۷

۶۲۔ایضاً،ص ۴۸

۶۳۔ایضاً ص ۵۳

۶۴۔ایضاً،ص ۶۰

۶۵۔ایضاً،ص ۶۵

۶۶۔ایضاً ص ۶۸

۶۷۔ایضاً ص ۶۹

۶۸۔ایضاً،ص ۷۱

۶۹۔ ایضاً،ص ۷۴

۷۰۔ ایضاً،ص ۷۵

۷۱۔ ایضاً،ص ۸۶

۷۲۔ ایضاً،ص ۸۷

۷۳۔ ایضاً،ص ۸۸

۷۴۔ ایضاً،ص ۸۹

۷۵۔ ایضاً،ص ۱۰۱